ترقی پسند معترضینِ غزل ــــ اور کلاسیکی غزل

ڈاکٹر فرزانہ ریاض،لیکچرار،شعبۂ اُردو،جی سی یونیورسٹی،لاہور

Abstract

In the modern period of Ghazal i.e. post era of 1880. Two thoughts were being reflected in the poetry. Urdu poetry was in its bloom. However, after war of independence, the sub-continent faced a tremendous change in every filed of life, which also affected the poects. In such circumstances, "Altaf Hussain Hali" criticized 'Ghazal' through his book "Maqadma-e-Shero-o-Shairy." Many literary persons were influenced by the thoughts of "Hali" including Azmat Ullah Khan, Kalim-ud-Din Ahmad, Nazm Taba Tabai, Josh etc. It was criticized by many powerful literary personalities in the first quarter of twentieth century. However, there were some liberal poets who revitilized the Ghazal when it was being discarded and criticized by every literary organization.

حالؔی، جوش اور عظمت اللہ خاں کے بعد ترقی پسند تحریک نے غزل کے خلاف ایک بار پھر احتجاج کی آواز بلند کی۔ اس احتجاج میں بھی زیادہ گہرائی نہیں تھی۔

روایت کے خلاف بغاوت کی لَے ۱۹۴۹ء کی کل ہند کانفرنس کے بعد تیز ہو جاتی ہے کیونکہ اس کانفرنس نے جو انتہا پسندانہ منشور پاس کیا تھا اس کی رو سے ادب میں انفرادیت، اسلوب پرستی اور اس طرح کے دوسرے رجعت پرست رجحانات کی ہمت افزائی کرنا تھا۔ عوام کے ذہنوں کو الجھانا اور اپنے مقصد سے ہٹانا تھا۔ تحریک نے اپنے منشور میں مقصدیت پر زور دیا تھا اور اردو کے ادیبوں کو سماجی ذمہ داری قبول کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

ترقی پسندوں نے اپنے ادبی تصوّرات اور مارکسی شعریات کی روشنی میں غزل کی مخالفت کی اور غزل کو ناکارہ، غیر ترقی یافتہ صنف سخن سمجھا جانے لگا۔ وہ اعتراضات جو حالؔی کے زمانے سے شروع ہوئے تھے اب جوش ولولے کے ساتھ ہونے لگے۔

ترقی پسند دانشوروں نے اولاً روایت اور روایت سے زیادہ قدامت سے بیزاری کا اظہار کیا۔ ابتدائی مرحلے میں روایت سے بے زاری کو بے حد فروغ دیا گیا۔ ترقی پسند نظریہ شعر کی بنیاد جن اصولوں پر قائم ہے وہ کسی بھی دوسری ادبی صنف کے لیے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کے ادبی منشور میں جو اصول وضع کیے گئے۔ ان

میں یہ وضاحت نہیں تھی کہ شاعری اور فکشن کے درمیان فرق کو نظر انداز کرنے کے سبب ترقی پسند شعری جمالیات کے امتیازات واضح نہ ہو سکے۔

ترقی پسند شاعری کے ابتدائی زمانے میں روایتوں سے بغاوت برتی گئی اور اس روایت کو آج بھی برتنا چاہیے۔لیکن جس حد تک اس بغاوت میں شاعری کے میڈیم اور ادراک حقیقت کی گہرائی کو نظر انداز کیا گیا۔شاعری مجموعی حیثیت سے سطحی رہ گئی۔اس سطحیت میں سیاسی موضوعات کو دخل نہیں ہے۔یہ سطحیت دراصل ترقی پسند شاعروں کی اپنی ہے۔شعروسخن کے میڈیم کو نہ سمجھنے اور ادراک کو اپنی شخصیت کا جزو بنانے کا باعث۔

حالؔی کے بعد غزل کی مخالفت ایک فیشن بن چکی تھی۔مگر ترقی پسندوں نے مارکسی شعریات کی روشنی میں غزل کی مخالفت کے نئے جواز ڈھونڈ لیے تھے۔ترقی پسند تحریک سے قبل غزل پر جو اعتراض کیے گئے تھے ان میں حد درجہ یکسانیت تھی لیکن ترقی پسندوں نے غزل کی مخالفت میں نو مسلموں کا سا رویّہ اپنایا۔غزل کی ریزہ کاری میں مقصدیت کو سمو لینا آسان نہ تھا۔اور پھر اکثر نوجوان ترقی پسند شعرا اپنے شعری سفر کی ابتدا سے گزر رہے تھے۔اس لیے فن پر اتنی دسترس نہیں رکھتے تھے کہ غزل کے مزاج کو اپنی سیاسی مزاج سے ہم آہنگ کر سکتے۔اس لیے انھوں نے غزل کی مخالفت میں ہی عافیت سمجھی۔ڈاکٹر یوسف حسین خان اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’ترقی پسند نوجوانوں کو غزل کے مقابلے میں نظم اس لیے بھی پسند ہے کہ اس کا لکھنا نسبتاً آسان ہے۔غزل جتنی ریاضت چاہتی ہے وہ ان کے بس کی بات نہیں۔دوسرے یہ کہ اس طبقے میں غزل کی پابندیاں اور آداب مقبول نہیں۔اس لیے کہ انھیں برتنے کا ان لوگوں میں جیسا چاہیے ویسا سلیقہ اور ذوق نہیں۔پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اپنے ادب اور اپنی ذہنی روایتوں سے ناواقف ہیں۔وہ مغربی ادب کی ریس میں آزاد اور عاری نظم کو اردو میں بھی رواج دینا چاہتے ہیں......لیکن میرا خیال ہے کہ اس صورتِ حال کے خلاف جلد ردِ عمل رونما ہوگا اور ہمارا ادبی ذوق ہمیں بہت دنوں تک ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دے گا......مغربی ادب کے زیرِ اثر ممکن ہے غزل نگاری کو عارضی طور پر روز بد دیکھنا پڑے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غزل اس جوکھم کو جھیل جائے گی۔اس میں اتنی قوتِ حیات موجود ہے کہ تھوڑا بہت ظاہری روپ بدل کر پھر اپنی گدی پر براجمان ہو جائے۔‘‘(۱)

ترقی پسندوں نے اپنے ادبی تصوّرات اور مارکسی شعریات کی روشنی میں غزل کی مخالفت کی۔جس کی اہم وجہ غزل کی رمزیت، اجمال اور اس کے ہر شعر کا اپنے آپ میں مکمل ہونا تھا۔دراصل یہی غزل کی اہم خصوصیت بلکہ اس کا فن ہے،لیکن ترقی پسندوں نے اس کو ریزہ خیالی سے تعبیر کیا۔

ظاہر ہے کہ غزل میں تفصیل وتسلسل، پیغام رسائی اور پروپگنڈے کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔دوسرے یہ کہ بہت سے ترقی پسند شعرا غزل کے فن پر دسترس بھی نہیں رکھتے تھے۔اس لیے وہ غزل کے مزاج ومعیار سے ہم

آہنگی پیدا نہ کر سکے۔علاوہ ازیں جن مقاصد ونظریات کے وہ حامل تھے،ان کے اظہار کے لیے نظم کی صنف زیادہ موزوں تھی۔

ترقی پسند شعرا کے ذہن میں نظم وغزل کا بنیادی فرق واضح نہیں تھا اس لیے انھوں نے غزل کے اس ہنر کو عیب سمجھا جو مختلف تجربات واحساسات کا گلدستہ پیش کرتی ہے۔انھوں نے اس اعتراض کو بالکل صحیح مان لیا کہ غزل میں مختلف تجربات کا بیان ریزہ خیالی ہے اور یہ جرم ہے۔

ترقی پسندوں نے غزل پر جو الزمات عائد کیے۔ان میں سب سے نمایاں الزام یہ تھا کہ شعرا قوافی کو ایک جگہ جمع کر لیتے تھے۔اور انتہائی کدوکاوش کے بعد غزل پوری کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

عاری نظم لکھنے والے وزن وقافیے کو اس لیے ترک کرتے ہیں کہ اس طرح ان کے خیال کو پوری آزادی مل جائے گی۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس طرح جتنا حاصل کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ کھودیتے ہیں۔وزن اور قافیہ ذہن اور حافظے کو ایک نقطے پر مرکوز کردیتے ہیں تاکہ جذبہ اپنے آپ کو ضبط کے سانچے میں ڈھالے اور شعر کی جو خارجی صورت ظہور میں آئے وہ اس کی فطرت ثانی معلوم ہو نہ کہ اس کے پاؤں کی زنجیر۔شعر کی اس خارجی صورت میں ایسی قدریں مضمر ہوتی ہیں جو خود تخلیق کی محرک بن جاتی ہیں۔اور جب وہ فن کار کی روح سے وابستہ ہو جاتی ہے تو اظہار میں ان سے مدد ملتی ہے۔اس لیے یہ خیال درست نہیں کہ وزن قافیہ جو غزل کی خارجی ٹیکنیک سے عبارت ہیں اظہار میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ جب فن کار خارجی ٹیکنیک پر فاتحانہ انداز میں قدرت پالیتا ہے تو اس کے وجدانی نقوش جمالیاتی امتزاج کی پوری قوت اور تازگی کے ساتھ ظہور میں آتے ہیں اور دلوں کو لبھاتے ہیں۔

غزل پر عائد کردہ الزامات میں اکثر الزامات وہی تھے جو حالیؔ یا عظمت اللہ خان نے لگائے تھے لیکن ترقی پسندوں کو غزل میں دو خامیاں نظر آتی تھیں۔پہلی یہ کہ وہ اجتماعی اور سماجی شعور کی عکاسی کی بجائے فرد اور اس کی اہمیت پر زور دیتی ہے،دوسری بات یہ ہے کہ قدیم عہد میں تصوّف ایک فیشن کی طرح سماج پر مسلّط تھا اور تصرف کے پاس کوئی طے شدہ نظریۂ حیات نہیں تھا۔اس لیے غزل فرد کے انتشار پسند خیالات کا مجموعہ ہو کر رہ گئی تھی۔

یہ انتشار کسی نہ کسی حد تک تمام غزل گو صوفی شعرا کے یہاں مل جاتا ہے اور جو صوفی نہیں ہیں ان کے یہاں تقلیدی انتشار رہے۔اس انتشار کے جہاں اور اسباب تھے،ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ سماجی شعور کو عملی میدان میں دریافت کرنے کے بجائے اپنی ذاتی فکر اور خیال کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔یوں تو انفرادی شعور سماجی شعور کا جزو ہے لیکن اس جزو کی صداقت کو بھی سماجی عمل کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے۔چونکہ صوفی تفکر کو عمل پر مقدم سمجھتے تھے اس لیے وہ اپنے شعور کو سیاسی عمل کے تابع ہونا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔وہ صرف ترویجِ خیال کے ذریعے قلب کی ماہیت کرنا چاہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب تک ہمارے ملک میں سماجی شعور کسی منظّم تحریک کی صورت میں پیدا نہ ہوسکا۔غزل کا انتشار ہمارے ذہنوں پر مسلّط رہا۔

بعض ترقی پسند نقاد جو غزل اور نظم میں مفاہمت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ان سارے واقعاتِ کو غزل کے

سلسلے میں غلط فہمیوں پر محمول بتاتے ہیں۔علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

''ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے اور ترقی پسند ادیبوں نے ماضی کے تمام کارناموں اور روایت سے کبھی انکار نہیں کیا ہے، البتہ ان کے سمجھنے میں ان سے دو قسم کی غلطیاں ہوئی ہیں۔کبھی انھوں نے جوش میں بعض صحت مند روایت سے بھی انکار کیا اور کبھی اپنی وسیع النظری کے نام پر غیر جمہوری اور بیمار روایت کو بھی اپنا لیا......اس قسم کی غلطی غزل کے سلسلے میں ہوئی۔بعض ترقی پسندوں نے غزل کے غیر جمہوری، تاریک اندیش، فراری، کھوکھلے اور صوفیانہ مضامین کی مخالفت کے بجائے غزل کی صنف کو ہی غیر جمہوری اور بے کار قرار دیا......لیکن اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ جس طرح ماضی کی روایت کے سلسلے میں ترقی پسندوں نے مجموعی طور سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا، اسی طرح غزل کی مخالفت بھی ترقی پسند تحریک کا پروگرام نہیں بنی۔غزل موضوع بحث رہی اور نیا ادب اور دوسرے ترقی پسند رسائل کے صفحات پر غزل کی مخالفت اور موافقت میں مضامین شائع ہوتے رہے۔یہی وجہ ہے کہ غزل پر بحث بھی ہو رہی تھی اور ترقی پسند غزل بھی کہی جا رہی تھی۔''(۲)

علی سردار جعفری کے خیال میں ترقی پسندوں کو غزل کے مضامین کی مخالفت کرنی چاہیے تھی مگر انھوں نے اس صنف کو ہی غیر جمہوری اور بے کار قرار دے دیا۔البتہ حقیقت یہ ہے کہ اس انتہا پسندی کے باوجود غزل مسلسل موضوع گفتگو بنی رہی۔اس پر مضامین بھی لکھے جاتے رہے اور ترقی پسند غزلیں بھی کہی جاتی رہیں۔

غزل کی مخالفت اگرچہ ترقی پسندوں نے بطور فیشن اختیار کر لی تھی۔لیکن بعض ترقی پسند نقاد، ترقی پسندوں کے اس رجحان کو بھی ہدف تنقید بنا رہے تھے۔اس سلسلے میں سجّاد ظہیر کی رائے بہت واضح ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ہم بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عہدِ حاضر میں عظیم اور اچھی شاعری جس سے آج مکمل ذہنی اور روحانی تسکین ہو غزل کے سانچے میں محدود نہیں کی جا سکتی لیکن بعض لوگ جب ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ گزشتہ چند سالوں میں فارسی اور اردو غزل کے جو بہترین نمونے ہیں وہ لازمی طور پر عظیم شاعری نہیں ہو سکتی اور یہ کہ غزل ایک صنف کی حیثیت سے بیشتر جاگیری دور کے انحطاط، افراتفری اور انتشار کی عکاسی کرتی ہے، تب میرے خیال میں ہم سخت غلطی کرتے ہیں۔''(۳)

اسی طرح آلِ احمد سرور نے نئے ادب کے لیے تہذیبی سرمائے اور تمدنی میراث کو ناگزیر بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''مغربیت اور جدیدیت پر زور دینے سے مراد یہ نہیں کہ ہم اپنے ماضی کے عظیم الشان کارناموں کو نظرانداز کر دیں اپنے ادب کے ہندوستانی اور مشرقی مزاج کو بھول جائیں۔نیا ادب......تہذیبی سرمائے اور تمدّنی میراث سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔''(۴)

مجنوں گورکھپوری نے بھی ماضی کی روایات سے متعلق انتہا پسندانہ خیالات کی مخالفت کی جو بالواسطہ طور پر غزل کی حمایت میں گئی۔

> ''میں اس گروہ کی ہاں میں ہاں نہیں ملا سکتا۔ جو ادب کو سیاست کی طرح صرف عصری حالات کا آئینہ تصوّر کرتا ہے۔ اور اس کو وقتی اور عارضی چیز بتائے رکھنا چاہتا ہے۔ یہ گروہ ماضی کے اکتسابات کی قدر و قیمت کو تسلیم نہیں کرتا اور ان کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہتا ہے یہ کم ظرفوں اور سبک سروں کا گروہ ہے۔''(۵)

غزل کی اہمیت اور غزل کے گرانقدر وراثتی سرمائے سے متعلق ترقی پسندوں کے نظریات مختلف تھے۔ لیکن اس بات پر سب متفق تھے کہ ادب کا اجتماعی زندگی سے گہرا ربط ہے ان کے نزدیک ادب ایک سماجی عمل ہے اور ادیب سماج کا ایک باشعور فرد۔ اس لیے شاعروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی شاعری کو سماجی مفادات کے لیے استعمال کریں۔ اس لیے یہ ترقی نقادوں کی ذمہ داری ہے کہ قدیم ادبی سرمائے سے انحراف نہ کرتے ہوئے ماضی کے پتھروں سے ان سرچشموں کو ڈھونڈیں جن سے صدیوں تک ہماری کشتِ ادب کی آبیاری ہوئی۔ باقر مہدی نے ایک تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اصل میں غلط فہمی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ہماری توقعات غزل اور نظم دونوں سے یکساں ہوتی ہیں۔ غزل کی چند فنی پابندیاں ہیں۔ اس پیمانے میں اتنی مئے نہیں آتی کہ ایک ہی جرعے خوار کو مخمور کر دے۔ البتہ اتنا نشہ ضرور آجاتا ہے کہ ذہن میں ایک سرور اور رگوں میں خون دوڑنے لگے۔ اگر ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے ہیں، تو یہ ہماری خوش فہمی ہے۔''(۶)

رشید احمد صدیقی کا یہ جملہ ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔'' انتہا پسندانہ ہوتے ہوئے اتنا بلیغ ہے کہ اسے بلاتفریق واختلاف کے اردو شاعری کی پوری روایت پر ثبت کیا جا سکتا ہے۔

غزل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھوں نے ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کو کوئی مستحسن اقدام تصوّر نہیں کیا۔ ان کے الفاظ ہیں:

> ''ترقی پسندی اب تک غزل کو اپنی کوئی واضح چھاپ نہیں دے سکی۔ باوجود اس کے کہ نئی مصطلحات اور موضوعات کا غزل میں بڑی آزادی سے اضافہ کیا گیا ہے۔ ترقی پسندوں کی غزل گوئی سے غزل ترقی پسند نہ ہوئی......ترقی پسند غزل گویوں میں صرف فیض اور فراق ایسے ہیں، جنھوں نے نیا مزاج اور زاویہ دے کر اس کی خوبی وخصوصیت میں اضافہ کیا لیکن وہ اتنا ترقی پسندانہ نہیں جتنا شاعرانہ عارفانہ اور عارفانہ شاعرانہ ہے۔''(۷)

ترقی پسند غزل اور غزل پر کیے جانے والے حملوں کے حوالے سے رشید احمد صدیقی کی رائے آج خاصی اہم معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ:

''ترقی پسند غزل کو رسوا کرنے میں خود رسوا ہو گئی۔''(۸)

غزل کی تمام تر مخالفتوں کے باوجود ترقی پسند شعرا غزل گوئی سے پوری طرح اپنے کو الگ نہیں کر پائے۔ تحریک کی ابتدا سے ہی ہمیں ترقی پسند شاعروں کے یہاں غزل کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً معین احسن جذبی، مجروح اور عزیز حامد مدنی کی شہرت و مقبولیت اور شاعرانہ حیثیت ہی ان کی غزل گوئی کی وجہ سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ترقی پسندوں نے اپنے نظریۂ ادب اور مقاصد کی تکمیل میں غزل کو نہ صرف حائل تصوّر کیا بلکہ اس کے حوالے سے بعض تعصّبات کے شکار بھی رہے۔ اس لیے ہمیشہ غزل کو حاشیے پر ہی رکھا گیا۔ اس دور میں غزل کا لکھا جانا ممنوع ہو گیا۔ بہت سے ادیب تحریک کے منشور سے متفق نہیں تھے اور وہ اپنے کو منشور کے مطابق نہیں ڈھال سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے خاموشی اختیار کر لی یا تحریک سے دور ہوتے چلے گئے۔ معین احسن جذبی نے نومبر ۱۹۵۱ء میں ''فروزاں'' کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں لکھا:

> ''میری کم گوئی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ صحت کی خرابی سے قطع نظر ادب کے بدلتے ہوئے نظریات نے عجیب الجھن پیدا کر دی تھی۔ ادھر کچھ عرصہ سے ترقی پسندوں میں ایک رجحان پیدا ہو گیا ہے جو بڑی حد تک تنگ نظری پر مبنی ہے۔ ہمارے شاعری اور ادیب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ حسن و عشق کا ذکر ترقی پسندی کے مذہب میں وہ گناہ ہے جو شاید ہی بخشا جائے۔ حسن و عشق کے خالص انفرادی جذبات سے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ ازل سے آج تک یہ دلوں کو گرما رہے ہیں اور گرماتے رہیں گے۔''(۹)

اسی طرح فیض احمد فیض نے بھی عشقیہ جذبات کی ترجمانی کو حق بجانب ٹھہراتے ہوئے رضیہ سجاد ظہیر کو لکھا:

> ''ہمارا جیل میں اگر عاشقانہ شعر کہنے کو دل چاہے گا تو ہم ضرور لکھیں گے۔''(۱۰)

ان واقعات سے یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ اس وقت فضا غزل کے مخالف تھی۔ مگر ساتھ ہی رفتہ رفتہ فضا میں تبدیلی بھی شروع ہو جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک اب زیادہ مقبول نہیں رہی اور اس کا ترجمان شاہراہ بھی رفتہ رفتہ تنزل کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ ادیبوں و شاعروں میں ایک طرح کی بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر ان لوگوں کی بھی آنکھیں کھلتی ہیں جو ادب میں انتہا پسند خیالات کی ترجمانی پر زور دے رہے تھے۔ بالآخر مارچ ۱۹۵۳ء میں دہلی میں اس سلسلے میں ایک دوسری کانفرنس منعقد ہوتی ہے اور منشور میں نظر ثانی کی جاتی ہے۔ یہ منشور شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقی آزادی پر زور دیتا ہے۔ اس منشور کے پاس ہونے کے بعد ادیبوں کو ایک کھلی فضا کا احساس ہوتا ہے جن لوگوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی وہ لوگ ایک بار پھر سرگرم ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جب غزل بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے لکھی جانے لگی۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس دور میں غزل کا احیاء ہوا، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس خیال سے متفق نہیں ہیں۔

۱۹۵۲ء میں فیض کا دوسرا مجموعۂ کلام ''دستِ صبا'' شائع ہوا۔ ''دستِ صبا'' نے بھی غزل کو دوبارہ مقبول عام بنانے میں مدد دی۔ اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''دستِ صبا کی مقبولیت کے بعد شاہراہ گروپ کے شعرا بین الاقوامی اور عالمی مسائل کی نظمیں چھوڑ کر غزل گوئی کی طرف لوٹ آئے۔''(۱۱)

پروفیسر قمر رئیس کی بھی یہی رائے ہے:

''آزادی کے بعد برِصغیر پاک و ہند میں غزل کو جو حیاتِ نو ملی ہے اور اس کی مقبولیت میں جو اضافہ ہوا ہے اس میں فیض کی غزل کا بھی نمایاں حصہ ہے۔''(۱۲)

ترقی پسندوں میں غزل کو مقبول عام بنانے کا سہرا عام طور پر لوگ فیض کے سر باندھتے ہیں لیکن مجروح سلطان پوری کا اصرار ہے کہ اس سے قبل ہی یعنی ۱۹۵۰ء کے آخر میں جب وہ جیل سے اپنی غزلیں لے کر باہر آئے تو غزل کے بارے میں نئے سرے سے رائے قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۵۰ء کے آخر میں جب میں جیل سے اپنی نئی غزلیں لے کر باہر آیا تو ہمارے رفیقوں کو غزل کے بارے میں نئے سرے سے رائے قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔عام طور پر غزل میں سیاسی اور سماجی مسائل کا اور خصوصاً جبر سیاست کا ذکر غزل میں اس کی اپنی تمام مخصوص اشاریت اور غزلیہ طرزِ بیان کی اوّلیت کا مستحق لوگ فیض اور صرف فیض کو سمجھتے ہیں۔اس بات پر اصرار میں اس لیے کر رہا ہوں کہ سیاسی مضامین برتنے کے سلسلے میں میں نے لائق ستائش ہی اشعار نہیں کہے بلکہ افراط و تفریط کا بھی شکار رہا ہوں۔''(۱۳)

البتہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ترقی پسند غزل گو شعرا کی کوششوں سے نہ صرف غزل کو کھویا ہوا وقار حاصل ہوا، بلکہ فیض اور مجروح کے علاوہ بعض دوسرے شعرا جیسے مجاز، جذبی، اختر انصاری، پرویز شاہدی اور جاں نثار اختر وغیرہ غزل کی کلاسیکی روایت اور ترقی پسند تصوّرات کے درمیان سے ایک نئی راہ نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ ترقی پسند شعرا اپنے تمام انقلابی نظریات کے باوجود فنی اظہار میں روایت پرست تھے۔اس کلاسیکیت کا اظہار ان کی غزل میں بخوبی ہوا ہے۔بہرحال غزل کی کشتی انہی طوفانوں میں آگے بڑھتی رہی۔

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان۔اردو غزل (لاہور:القمر انٹر پرائزز،۱۹۵۲ء)ص ۱۵

۲۔ مظفر حنفی۔مرتب:جدیدیت تجزیہ و تفہیم (کلکتہ:نسیم بک ڈپو،۱۹۸۵ء)ص ۶۲۰

۳۔ ایضاً۔ص ۳۳

۴۔ آل احمد سرور۔نئے اور پرانے چراغ (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ،۱۹۶۷ء)ص ۳۸۱

۵۔ آل احمد سرور۔ادب اور نظریہ (لکھنؤ:فروغِ ادب،۱۹۷۳ء)ص ۸۴

۶۔ مظفر حنفی۔مرتب:جدیدیت تجزیہ و تفہیم۔ص ۳۹۶

۷۔ مجنوں گورکھپوری۔غزل سرا(نئی دہلی: مکتبہ جامعہ،۱۹۶۴ء)ص۲۷۲
۸۔ ایضاً۔ص۲۷۳
۹۔ معین احسن جذبی۔فروزاں(علی گڑھ:انجمن ترقی اردو،۱۹۵۱ء)ص۲
۱۰۔ وزیر آغا۔معنی اور تناظر(سرگودھا:مکتبۂ کارواں،۱۹۹۸ء)ص۲۶۱
۱۱۔ کامل قریشی۔اردو غزل(لاہور:پروگریسو بکس،۱۹۸۹ء)ص۲۶۸
۱۲۔ کامل قریشی۔اردو غزل(دہلی:اردو اکادمی،۱۹۸۷ء)ص۲۶۸
۱۳۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۲ء)ص۲۲۵
۱۴۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی۔تاریخ جدید اردو غزل(حیدرآباد دکن:مکتبۂ اشاعتِ اردو،۱۹۵۵ء)ص۶۷۱
۱۵۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔غزل اور مطالعۂ غزل(کراچی:انجمنِ ترقی وار دو،۱۹۵۰ء)ص۴۰۷
۱۶۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان۔اردو غزل ص۱۲
۱۷۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔غزل اور مطالعۂ غزل ص۶۷۲

مآخذ:

۱۔ آل احمد سرور۔ادب اور نظریہ لکھنؤ:فروغِ ادب،۱۹۷۳ء۔
۲۔ آل احمد سرور۔نئے اور پرانے چراغ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ،۱۹۶۷ء۔
۳۔ عبادت بریلوی،ڈاکٹر۔غزل اور مطالعۂ غزل کراچی:انجمنِ ترقی وار دو،۱۹۵۰ء۔
۴۔ کامل قریشی۔اردو غزل لاہور:پروگریسو بکس،۱۹۸۹ء۔
۵۔ گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر۔اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۲ء۔
۶۔ مجنوں گورکھپوری۔غزل سرا نئی دہلی: مکتبہ جامعہ،۱۹۶۴ء۔
۷۔ مظفر حنفی۔مرتب:جدیدیت تجزیہ و تفہیم کلکتہ:نسیم بک ڈپو،۱۹۸۵ء۔
۸۔ معین احسن جذبی۔فروزاں علی گڑھ:انجمن ترقی اردو،۱۹۵۱ء۔
۹۔ وزیر آغا۔معنی اور تناظر سرگودھا:مکتبۂ کارواں،۱۹۹۸ء۔
۱۰۔ وقار احمد رضوی،ڈاکٹر۔تاریخ جدید اردو غزل حیدرآباد دکن:مکتبۂ اشاعتِ اردو،۱۹۵۵ء۔
۱۱۔ یوسف حسین خان،ڈاکٹر۔اردو غزل لاہور:القمر انٹر پرائزرز،۱۹۵۲ء۔

☆☆☆